منشی پریم چند کا افسانہ 'نمک کا داروغہ' تاریخ کے پس منظر میں

ڈاکٹر محمد محسن
کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ملخص

زیر نظر افسانہ 'نمک کا داروغہ' منشی پریم چند کا مشہور ترین افسانہ ہے جو پریم چند کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تخلیقی جہات پر مبنی ہے۔ اس افسانے سے مصنف نے حق شناسی اور ایمانداری کا پیغام دیا ہے۔ مقالے کی ابتدا تمہید میں برطانوی حکومت کے ذریعے نمک پر لگائے گئے ٹیکس کے قانون پر مدلل بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مظلوم ہندوستانیوں پر انگریز حکمران نے جو ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے تھے۔ پس اس بربریت کو مفصل پیش کیا ہے۔ بجز اس کے منشی پریم چند کی سوانحی پس منظر، تعلیمی سفر، تدریسی خدمات، ادبی سرگرمیوں اور تصانیف وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعدہٗ آخر میں افسانہ 'نمک کا داروغہ' پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

افسانہ نمک داروغہ پریم چند بنسی دھر الوپی دین انگریز
ٹیکس سول نافرمانی

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغلیہ سلطنت کے نظام کو درہم برہم کرنے کے بعد متحدہ ہندوستان پر اپنی ناجائز حکومت مسلط کرلی تھی۔ برطانوی حکمرانوں نے ہندوستانیوں پر آئے دن طرح طرح کے ظلم وستم کے ساتھ ساتھ مختلف نوعیت کے ٹیکس لگاکر غریب کمزور عوام کی کمر توڑ رکھی تھی۔ انہی خراج میں سے ایک ''نمک کا ٹیکس'' ہے۔ برصغیر کی عوام نے حکومت انگریز کے خلاف ایک تحریک چلائی تھی جو نمک ٹیکس کی مخالفت میں تھی۔ اس تحریک سول نافرمانی میں ملک گیر طور پر عوام، خواتین اور بچوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔

۳۱/ دسمبر ۱۹۲۹ء (لاہور) کو کانگریس نے مکمل خود مختاری کا دعویٰ پیش کیا۔ قرار داد میں یہ پاس کیا گیا کہ انگریزی حکومت کو ٹیکس نہیں دیا جائے۔ اس قرار داد کے بعد برصغیر کی عوام نمک ٹیکس کے خلاف علم بردار ہو گئے۔ موہن داس کرم چند گاندھی نے اپنے ایک مقالہ میں تحریر کیا کہ نمک ٹیکس کے سبب ہی ہندوستانی عوام جذام میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اس لیے نمک ٹیکس کے خلاف قانون شکنی میں ہندوستانی عوام صف آرا ہو گئے۔

تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو موریہ سلطنت اور مغلیہ دور میں بھی نمک پر ایک بڑا محصول عوام سے وصول کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر کی عوام پر دکھ اور درد کا پہاڑ یہ بلند کیا کہ نمک کی پیداوار اور کاروبار پر رفتہ رفتہ اجارہ داری قائم کر لی۔ نمک ٹیکس میں اس قدر دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا کہ ہندوستانی ناتواں عوام اس لگان کو ادا کرنے سے قاصر تھے۔ کیوں کہ عوام اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کی حکومت نہیں ہوتی وہ قوم غریب و نادار ہو جاتی ہے۔ جس قوم کی حکومت ہوتی اس کا خزانہ لبریز ہوتا ہے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا غیر انسانی فعل اس حد تک آ پہنچا کہ ہندوستانی عوام کی نمک پیداوار اور اس کی تجارت پر مکمل طور پر روک لگا دی اور قانون نافذ کیا کہ اس کے خلاف ورزی کرنے والے پر چھ ماہ بامشقت قید کی سزا دی جائے گی۔ مزید بر آں کہ وائسرائے رارڈ ریڈنگ کے عہد میں ۱۹۲۳ء میں نمک پر لگان دوگنا کرنے کی قرار داد پاس کی گئی۔

۵/ اپریل ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی نے گجرات کے شہر احمد آباد میں موجود سابرمتی آشرم سے سرگرم ساتھیوں کے ساتھ ایک پیدل مارچ کا آغاز کیا۔ یہ پیدل مارچ ۳۸۵ کلومیٹر کی مسافت طے کر کے گجرات کے ایک ساحل ڈانڈی پر پہنچ کر احتجاج کا سراپا بلند کیا اور گاندھی جی نے اپنے ہم راہوں کے ساتھ مل کر ۶/ اپریل ۱۹۳۰ء کو نمک پیداوار کر کے انگریزی حکومت کی کھلے طور پر حکم عدولی کی۔

اس تحریک میں مرد و خواتین دونوں پیش پیش شامل تھے۔ چٹوپادھیائے نامی ایک خاتون بھی سول نافرمانی تحریک میں شامل تھیں۔ ان کی رہنمائی میں کافی تعداد میں خواتین ۱۶/ اپریل ۱۹۳۰ء کو بمبئی کے قرب وجوار کے سالٹ ڈیپو کی طرف ہجوم لے کر رواں دواں ہوئیں۔ پولیس کے ساتھ جھڑپیں بھی ہوئیں اور اس جھڑپ کے دوران

چٹو پادھیائے زخمی بھی ہو گئیں لیکن احتجاج ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوئیں۔ نیز ہجوم لے کر نمک کے ٹیلے کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔

بہر حال مہاتما گاندھی نے نمک پر محصول کے خلاف ستیہ گرہ تحریک جاری رکھا اور پیغام دیا کہ برصغیر کے عوام اس تحریک میں پیش پیش رہ کر نمک قانون کے خلاف ورزی میں اپنا نمایاں رول ادا کریں۔ لیکن اس تحریک میں اشتعال انگیزی و تشدد سے بچنے کی تلقین کی۔

سورت (گجرات) سے ۴/مئی ۱۹۳۰ء کو مہاتما گاندھی کو گرفتار کر لیا اور وہاں سے منتقل کر کے انہیں پونا میں قید میں رکھا گیا لیکن کسی طرح کی کوئی قانونی کارروائی سے گریز کی گئی۔ مزید یہ کہ ان سے پہلے کانگریس پارٹی کے ایک عظیم لیڈر جواہر لال نہرو کو سول قانون کی نافرمانی پر قید کر لیا گیا تھا۔

مہاتما گاندھی کی قید کی خبر آگ کی چنگاری کی طرح ملک بھر میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق ستیہ گرہ میں شامل ہونے لگے۔ ۵/مئی ۱۹۳۰ء کو مشہور مؤرخ عرفان حبیب کے دادا عباس طیب اور مہاتما گاندھی کی اہلیہ کستوربا کی سرپرستی میں ستیہ گرہ احتجاج کی رہنمائی ہو رہی تھی۔ البتہ انہیں دھرسنا پہنچنے سے قبل ہی گرفتار کر لیا اور تین مہینے کے لیے جیل میں بند کر دیا گیا۔

بہر کیف اس تحریک میں سروجنی نائیڈو منسلک تھیں اور انہوں نے مضبوط قیادت سنبھال لیں۔ ان کی سرپرستی میں ہزاروں پیروکار موجود تھے۔ جنہوں نے دھرسنا میں نمک کی ایک کارگاہ پر چڑھائی کیں۔ اس عمل پر پولیس اشتعال انگیز ہو کر بھیڑ پر جبر و ظلم کی قہر ڈھایا۔ جس بنا پر سیکڑوں کی تعداد میں لوگوں کے سر پھٹے، ہاتھ ٹوٹے اور جانیں گئیں پھر بھی مرد و زن کی جم غفیر احتجاج سے پیچھے نہیں ہٹے۔ یہاں تک کہ لوگ بے حواس ہو کر گرے پڑے تھے۔ زمین پر چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر سو زمین پر خون ہی خون نظر آرہا تھا جو زندہ تھے وہ اپنے زخموں سے کراہتے ہوئے اس احتجاج کو پورے حوصلے کے ساتھ آگے بڑھا رہے تھے ایسے خوف زدہ

عالم میں بھی پولیس (انگریز) اپنے وحشیانہ فعل سے باز نہیں آرہی تھی اور ہر طرح کے جبر وبربریت کے پہاڑ برپا کررہے تھے اور لاشوں کو ٹھکانے لگارہے تھے۔

اس خوفناک منظر کو یونائیٹڈ پریس کے نمائندے ویب ملر نے اپنی جدوجہد سے انگریز حکمران کی اس غیر انسانی فعل کو دنیا کے سامنے لانے میں کامیاب رہے۔ اس دردناک سانحہ کو سیکڑوں اخبارات میں شائع کیا گیا۔

مندرجہ بالا المیہ کے بعد مہاتما گاندھی کی نمک ستیہ گرہ سے بیرون ممالک بھی آشنا ہو چکے تھے۔ جس سے اس تحریک کو پوری دنیا میں ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا گیا۔ نمک ستیہ گرہ کو کامیاب بنانے میں سیکڑوں ہندوستانی زخمی ہوئے، جیل گئے اور ساتھ ہی ساتھ شہید بھی ہوئے۔ بالآخر یہ تحریک ۱۹۳۱ء کی ابتدا تک قائم رہی۔

آخر کار انگریز سرکار نے مہاتما گاندھی کو جیل کی قید سے آزاد کیا تاکہ مہاتما گاندھی اور لارڈ ارون کے مابین باہمی گفتگو کی جائے۔ پہلی نشست کی بات چیت کے بعد دوسرے دور کی گفت وشنید کے لیے حالات سازگار ہوئے اور گاندھی جی گول میز کانفرنس کے لیے ۱۹۳۱ء میں لندن تشریف لے گئے۔ بعدہٗ گاندھی جی کی رہنمائی میں تحریکیں چلتی رہیں اور بالآخر متحدہ ہندوستان ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوگیا۔ بالخصوص ہم اپنے اسلاف کی قربانیوں کے سبب ہی ایک آزاد ملک میں خوشنما زندگی بسر کررہے ہیں۔

مندرجہ بالا تحریک پر اس لیے تفصیل سے بحث کی گئی ہے کیونکہ منشی پریم چند کو اپنے وطن ہندوستان سے بے پناہ الفت وانسیت تھی۔ وہ ہمیشہ آزادی کے لیے بے قرار رہتے۔ جس کی مثال یہ ہے کہ وہ گاندھی جی کی تحریک ’’عدم تعاون‘‘ سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ منشی پریم چند نے اپنے افسانہ ’’نمک کا داروغہ‘‘ لکھ کر ہندوستانی عوام کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ فرض سے آگاہی کا پیغام دیا جس کے نتیجے میں لوگ شدّت سے غلامی کو محسوس کرنے لگے۔ یوں تو انگریزوں کے خلاف ہندوستانی عوام اپنی قربانی پیش کرتے آرہے تھے۔ لیکن پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعے نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ پریم چند کا افسانہ ’’نمک کا داروغہ‘‘ لوگوں کو بیدار کرنے میں امتیازی رول ادا کیا۔ بیداری کے سبب ہی گاندھی جی کی تحریکیں

"عدم تعاون" اور "سول نافرمانی" (نمک ٹیکس) وغیرہ میں ہندوستانی عوام اپنی قربانی دینے کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہے۔

منشی پریم چند ایک علم رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ بیک وقت جہاں دیدہ شخصیت کے مالک تھے اور ادب کے عظیم افسانہ اور ناول نگاروں میں ان کا نام صفِ اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی ادبی صلاحیت اعلیٰ درجے کی تھی۔ جس صلاحیت کو بروئے کار لاکر انہوں نے افسانہ اور ناول کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ جو ان کی لافانی ادبی خدمات شمار کی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے اور ناولوں میں کئی موضوعات پر خامہ فرسائی کی مثلاً دیہات، کسان، مفلسوں کی بے کسی، مساوات، بے راہ روی اور معاشرے کی برائی و عیب وغیرہ موضوعات کو شدت کے ساتھ اپنی تخلیقی کارکردگی سے اُجاگر کیا۔ انہوں نے اپنی سادہ اور عام فہم زبان سے فکشن کو ایک نئی روش عطا کی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے پرانی روش رومانوی طرز نگارش سے نجات دلا کر حقیقت پسندانہ تحریر کی جانب مائل کیے۔

اردو فکشن کے عظیم قلم کار منشی پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا اور احباب خانہ انہیں نواب رائے کے نام سے پکارتے تھے۔ اس عظیم ہستی کی پیدائش ۳۱ر جولائی ۱۸۸۰ء کو اتر پردیش کے تاریخی شہر بنارس کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں لمہی میں منشی عجائب رائے کے گھر میں ہوئی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم اس عہد کے مطابق حسبِ معمول گاؤں کے ہی اسکول میں ایک مولوی صاحب کے اتالیق مکمل ہوئی۔ منشی پریم چند کے والد منشی عجائب رائے ڈاک خانے میں ایک معمولی سرکاری ملازم تھے۔ ہمیشہ ان کی زندگی تنگ دستی میں گزرتی تھی۔ جس کی بنا پر گھر کے مالی حالات بہتر نہیں تھے۔ کچھ عرصے بعد ان کے والد محترم کا تبادلہ گورکھپور کے ایک ڈاک خانے میں ہو گیا تھا، جب وہ وہاں گئے تو ساتھ میں اپنے لائق و فائق بیٹے منشی پریم چند کو بھی لے گئے وہاں گورکھپور کے ایک اسکول میں حصولِ تعلیم کی غرض سے داخلہ کرا دیا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہاں تعلیمی سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ البتہ جلد ہی بدلی ہو کر اپنے گاؤں لمہی میں مقیم ہو گئے اور ملازمت کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ اس اثنا میں منشی پریم چند کی والدہ ماجدہ اس دارِ فانی سے دار البقاء کی طرف کوچ کر گئیں۔ اس وقت پریم چند کی عمر صرف سات سال کی

تھی۔ والدہ کی وفات ہونے کی وجہ سے ان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور پریم چند کی زندگی اذیت اور مصیبت میں گزرنے لگی۔ چونکہ والد محترم نے دوسری شادی کرلی تھی۔ مزید یہ کہ منشی پریم چند زیر تعلیم تھے اور وہ میٹرک بھی نہیں کیے تھے کہ ظلم وستم کا یہ عالم رہا کہ ان کے والد گرامی نے پریم چند کی شادی ان سے زیادہ عمر کی ایک بدصورت لڑکی سے منحرف ہونے کے باوجود کردی۔ ظاہر ہے کہ پریم چند کی اس وقت ازدواجی زندگی بہتر نہیں تھی۔ تعلقات میں تلخیاں تھیں۔ خلیج بڑھ گئی جس کی وجہ سے نباہ نہیں ہورہا تھا۔ اس تکلیف دہ دور میں والد محترم کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ پسماندگان میں سوتیلی ماں اور دو سوتیلے بھائیوں کی معاشی ذمہ داری منشی پریم چند پر ہی آپڑی۔ منشی پریم چند کوسوں دور ننگے پاؤں پیدل ٹیوشن پڑھانے کی غرض سے صبح میں بنارس تشریف لے جاتے اور شب کی تاریکیوں میں گھر واپسی ہوتی تھی۔ گھر آکر چراغ کی مدھم روشنی میں میٹرک کے امتحان کی تیاری میں یک سوئی کے ساتھ لگ جاتے تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اردو اور فارسی کی مشہور معتبر تصانیف گلستاں بوستاں، آبِ حیات، طلسم ہوش ربا، فردوس بریں، امراؤ جان ادا، فسانۂ آزاد وغیرہ کتابوں کا مطالعہ بغور کرچکے تھے۔ اس دوران مطالعے میں مصروفیت کی بنا پر اکثر اوقات کھچڑی پکار کر ہی کھاتے تھے کیوں کہ کھچڑی پکانے میں ایک ہی برتن کا استعمال تھا۔ ایک برتن ہونے کی وجہ سے صفائی میں بھی وقت کم لگتا تھا۔ منشی پریم چند ۱۸۹۸ء میں میٹرک کرنے کے بعد وہ آگے کی تعلیم بھی جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی یہ رہی کہ حساب کے پرچے میں کم نمبر ہونے کی وجہ سے انہیں اس وقت کالج میں داخلہ نہیں مل سکا۔ ایک اسکول میں معلم کی حیثیت سے ملازمت قبول کرلی۔ کچھ مدت کے بعد الہ آباد کے ایک ٹریننگ اسکول سے درس وتدریس کا کورس مکمل کرنے کے بعد انہیں ایک سرٹیفکٹ تفویض کی گئی اور اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں کانپور کے ایک اسکول میں انہیں سرکاری نوکری مل گئی۔

منشی پریم چند اور زوجۂ اوّل کے مابین روز بروز تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ جس کے سبب بیگم نے علٰحیدگی اختیار کرکے اپنے مائیکے چلی گئیں۔ کچھ دنوں بعد منشی پریم چند نے اپنے خاندان اور سماج کے خلاف جاکر ایک

کم عمر بیوہ عورت شیورانی دیوی سے دوسری شادی کرلی۔ دوسری بیوی سے ان کے کل تین اولاد ہوئیں۔ جن میں ایک بیٹی کانام کملا اور بیٹوں کانام شری پت رائے اور امرت رائے تھا۔

کانپور میں ملازمت کے دوران پریم چند کی ملاقات جریدہ ’زمانہ‘ کے مدیر منشی دیانارائن نگم سے ہوئی دونوں کا آپس میں دوستانہ اور یارانہ رشتہ تھا۔ ۱۹۰۸ء میں پریم چند کا تبادلہ مہوبا ضلع ہمیرپور میں ڈپٹی اسکول انسپکٹر کی حیثیت سے ہوگیا۔ یہاں ایک دہائی قیام رہا۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں تبدیل ہوکر گورکھپور تشریف لے آئے۔ بعدہٗ یہاں آکر کچھ دن بعد انہوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

منشی پریم چند مہاتما گاندھی سے بہت متاثر تھے۔ انہیں ملک کا ایک عظیم رہنما مانتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستان ایک دن ضرور برطانوی حکومت سے آزاد ہوگا۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی تحریک ”عدم تعاون“ سے متاثر ہوکر اور جلیانوالہ باغ کا سانحہ نے پریم چند کے دل ودماغ پر گہرا اثر کیا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دے کر تحریک ”عدم تعاون“ اور ”سول نافرمانی“ تحریک میں تحریری طور پر حصہ لیا۔ نوکری چھوڑنے کے بعد پریم چند کی زندگی ایک بار پھر سے مفلسی کے شکار ہوگئی۔ اس بدحالی کو دور کرنے کے لیے انہوں نے چرکھوں کی تجارت شروع کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ کافی خسارہ ہوا، پھر تنگ آکر کانپور کے ایک اسکول میں ملازمت اختیار کرلی، یہاں بھی گزارا نہیں ہوسکا۔

بنارس میں انہوں نے سرسوتی پریس قائم کیا لیکن اسے کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ جس کی وجہ سے بند کردیا۔ آخر کار لکھنؤ چلے آئے اور یہاں انہوں نے نول کشور پریس میں نوکری کرلی۔ بجزاس کے انہوں نے نصابی کتابیں لکھیں اور ساتھ ہی ساتھ رسالہ ’ہنس‘ اپنی نگرانی میں نکالا۔ ۱۹۳۴ء میں پریم چند مایانگری چمک دمک کی دنیا بمبئی تشریف لے گئے۔ یہاں فلم ’مزدور‘ کی کہانی انہوں نے بذاتِ خود لکھی اور اس فلم میں مزدور کے لیڈر کا کردار بھی ادا کیا۔ لیکن بدقسمتی یہ رہی کہ رسوخ دار طبقے نے بمبئی میں اس فلم کی نمائش نہیں ہونے دی۔ لاہور اور دہلی میں دکھائی گئی لیکن وہاں بھی صنعت کاروں نے اپنی طاقت کا استعمال کرکے روک لگادی۔ باطنی طور پر پریم چند کو فلمی دنیا کی زندگی پسند

نہیں تھی۔ فلموں کے لیے تحریری کام اچھا خاصا مل رہا تھا لیکن بمبئی کی زندگی راس نہیں آنے کی وجہ سے وہ اپنے آبائی وطن بنارس واپس لوٹ آئے۔ لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس ۱۹۳۶ء میں منعقد کی گئی تھی۔ جس کانفرنس کی صدارت کا شرف منشی پریم چند کو حاصل ہوا۔

اردو فکشن کا ایک معزز و نامور شخصیت کا حامل منشی پریم چند اپنی زندگی کے آخری ایام میں غربت و ناداری سے جوجھ رہے تھے۔ طویل علالت کے عالم میں اپنے ہی گاؤں لمہی میں ۱۸/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو فانی دنیا سے باقی دنیا کی طرف منتقل ہو گئے۔

منشی پریم چند کی تخلیقی کام کی طرف نظر ڈالی جائے تو انہوں نے ابتداءً دو ڈرامے تحریر فرمائے تھے لیکن کسی بنا پر وہ ڈرامے چھپ نہیں سکے۔ کچھ عرصے بعد باضابطہ طور پر ان کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے ناول ''اسرارِ معابد'' سے ہوا۔ جو ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء کے درمیان ایک ہفت روزہ اخبار 'آوازۂ حق' میں بتدریج اور حصہ در حصہ شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ ان کے بے شمار شاہکار ناول منظر عام پر آئے۔ جس میں تکنیکی اعتبار سے 'میدانِ عمل' ایک لازوال ناول ہے لیکن جو شہرت و مقبولیت ان کے ناول ''گئودان'' کو ملی وہ دیگر کسی اور ناول کو نہیں ملی۔

منشی پریم چند کی افسانہ نگاری کا آغاز باضابطہ طور پر ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''عشق دنیا اور حب وطن'' ہے یہ افسانہ رسالہ 'زمانہ' کانپور میں نواب رائے کے نام سے اپریل ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ کچھ مہینے بعد پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوزِ وطن'' ۱۹۰۸ء میں نواب رائے کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل پانچ افسانے ''دنیا کا سب سے انمول رتن''، ''شیخ مخمور''، ''یہی میرا وطن ہے''، ''صلۂ ماتم'' اور ''عشق دنیا اور حب وطن'' شامل تھے۔ اس مجموعے کو انگریزی حکومت نے ضبط کر کے اسے آگ کی نذر کر دیا اور منشی پریم چند پر مقدمہ عائد کیا جس کی وجہ سے انہیں قید کر لیا گیا۔ مہاتما گاندھی کی مدد سے جیل سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوئے ۔ بہر حال پریم چند نے ان سب مشکلات کے باوجود بھی اپنی تخلیقی کام کو ترک نہیں کیا اور پائے استقلال میں استقامت قائم رہی اور انہوں نے پریم چند کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ تاحیات قائم رہا۔ پریم چند کی

اردو افسانہ نگاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۷ء تک کے عہد کا ہے۔ جس میں ان کے دو افسانوی مجموعے ''سوزِ وطن'' (۱۹۰۸ء) اور پریم پچیسی حصۂ اول (۱۹۱۵ء) منظر عام پر آئے۔ دوسرا دور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے جس میں پریم پچیسی حصۂ دوم (۱۹۱۸ء) پریم بتیسی حصۂ اول (۱۹۲۰ء)، پریم بتیسی حصۂ دوم (۱۹۲۰ء)، خاک پروانہ (۱۹۲۸ء)، خواب وخیال (۱۹۲۸ء)، فردوس خیال (۱۹۲۹ء)، پریم چالیسی حصۂ اول (۱۹۳۰ء) اور پریم چالیسی حصۂ دوم (۱۹۳۰ء) ہیں۔ آخری دور جسے تیسرا دور کہا جاتا ہے۔ اس کا عہد ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کا ہے۔ اس دور میں کل چار افسانوی مجموعے طبع ہوئے۔ ان میں آخری تحفہ (۱۹۳۴ء)، زادِ راہ (۱۹۳۶ء)، دودھ کی قیمت (۱۹۳۷ء)، واردات (۱۹۳۸ء) ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا کے کسی بھی مجموعے میں پریم چند کا شاہکار افسانہ کفن شامل نہیں ہے۔۔ اس کے علاوہ اور کئی افسانے بھی شامل ہونے سے قاصر رہے۔ پروفیسر قمر رئیس اس طرح رقم کرتے ہیں:

> ''ان مجموعوں میں پریم چند کی (ہندی سے اخذ ترجمہ) طویل کہانی 'روٹھی رانی' شامل نہیں جو الگ سے شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ 'سیر درویش' اور 'کفن' جیسی کہانیاں بھی مذکورہ مجموعوں میں شامل نہیں۔ ان سب کی مجموعی تعداد ۱۹۵ ہوتی ہے۔ جب کہ ہندی مجموعوں میں شائع ہونے والی ان کی کہانی کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔''

(پریم چند کے نمائندہ افسانے۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ صفحہ نمبر۔ ۱۳)

زیرِ بحث پریم چند کا افسانہ 'نمک کا داروغہ' ہے جو ۱۹۱۵ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ''منشی دھر'' ہے جس میں فرض کی ادائیگی اور ایمانداری کے جذبے کی علامت پائی جاتی ہیں۔ افسانے کی کہانی اس طرح ہے:

یہ بات اس وقت کی ہے جب انگریزی حکمران نمک پر پابندی عائد کی ہوئی تھی۔ اس افسانے کا ہیرو بنسی دھر ہے اور پورا افسانہ بنسی دھر کے ہی ارد گرد گھومتا ہے۔ بنسی دھر کے والد پنڈت جی جہاں دیدہ شخص تھے انھوں نے

اپنے بیٹے بنسی دھر کو بلایا اور گھر کے سارے حالات کا ذکر کیا کہ اب میرے اندر اتنی سکت باقی نہیں رہی اور تمہاری بہنوں کی عمر گنگا جمنا کے پانی کی طرح بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ کچھ ایسا کام کرو کہ باہر کی آمدنی ہو تا کہ گھر کے حالات بہتر ہو سکے۔ ایک طویل نصیحت امیز کلمات سننے کے بعد بنسی دھر پنڈت جی سے رخصت لیا اور کام کی تلاش میں نکل پڑے، اس وقت نمک صیغہ میں نوکری کی بحالی ہو رہی تھی۔ عوام تو عوام وکیل اور پٹواری بھی اس نوکری کے طلب گار تھے۔ بنسی دھر گھر سے ضرور کچھ میٹھا کھا کر نکلا ہو گا اس پر بھگوان کی کرپا اور پنڈت جی کی دعا تھی کہ بنسی دھر کو داروغۂ نمک کے عہدے پر نوکری ملی۔ بنسی دھر نے خط کے ذریعے بوڑھے باپ اور بیوی کو خبر بھیجی۔ پنڈت جی رشک کرنے لگے اور پڑوسیوں میں حسد و کینہ نظر آرہا تھا۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ”بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی۔ بنسی دھر سعادت مند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ اس وسیع دنیا میں جہاں اپنا استقلال، اپنا رفیق، اپنی ہمت، اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے۔ لیکن اچھے شگون سے چلے تھے۔ خوبیِ قسمت ساتھ تھی، صیغۂ نمک کے داروغہ مقرر ہو گئے۔ مشاہراہ معقول، بالائی رقم کچھ ٹھکانہ نہ تھا، بوڑھے منشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہو گئے۔ کلوار کی تسکین و تشفی کی سندلی، پڑوسیوں کو حسد ہوا اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ نرمی ہو گئیں۔“

(پریم چند کے نمائندہ افسانے۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ صفحہ ۳۷)

بنسی دھر حسبِ معمول نوکری پر تھے اور روزانہ کی طرح اپنے آفس میں موجود رہتے رات کو وہیں آرام کرتے تھے۔ پانچ چھ مہینے کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ایک رات شور شرابا کی آواز بنسی دھر کو نیند سے جگادی۔ بنسی دھر جب آنکھ کھول کر باہر دیکھا تو بیل گاڑیوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر بنسی دھر کو محسوس ہوا کہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔ فوراً اٹھے، وردی پہنی اور بندوق کو کمر میں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہو کر نکل پڑے۔ کچھ ہی وقت میں بنسی دھر بیل گاڑیوں کے

قافلے تک آ پہنچے۔اور انھیں تیز گرج کی آواز سے روک دیا!اور ان سے سوال کیا کہ کس کی بیل گاڑیاں ہیں؟کچھ دیر خاموشی کے بعد جواب ملا"پنڈت الوپی دین"کی۔ بنسی دھر نے حکمران کی حیثیت سے برق آواز سے پوچھا کون پنڈت الوپی دین؟جواب ملا"داتا گنج والے"یہ جواب سن کر بنسی دھر تعجب میں پڑ گئے اس لیے کہ پنڈت الوپی دین اس علاقے کا سب سے امیر آدمی تھا۔لاکھوں میں ان کی تجارت پھیلی ہوئی تھی۔بڑے سے بڑے انگریزی حکام ان کے یہاں آتے اور سلام پیش کرتے تھے۔ان کے ساتھ شکار پر جاتے اور طرح طرح کے دل جوئی کا کھیل کھیلتے تھے۔

بنسی دھر تھوڑی خاموشی کے بعد پھر سوال کیا۔کہ بیل گاڑیوں میں کیا ہے؟سب خاموش رہے،بنسی دھر خود گھوڑے کو آگے بڑھا کر ایک بیل گاڑی کے قریب لے گیااور اسے معائنہ کر کے دیکھا تو پتا چلا کہ ان پر نمک کے ڈھیلے لدے ہوئے ہیں۔اور یہ قانون کے خلاف تھا۔کچھ ہی دیر میں یہ خبر پنڈت الوپی دین تک پہنچی پنڈت جی اپنے خوبصورت گھوڑا گاڑی میں آرام فرمارہے تھے۔یہ خبر سن کر بہت آرام سے جواب دیا کہ چلو آرہے ہیں۔الوپی دین کو مال و دولت پر بڑا فخر تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ پیسے سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔یہاں تک کہ پیسے سے جنت بھی خریدی جاسکتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں الوپی دین داروغہ نمک کے پاس آگئے۔اور مسکراہٹ کے ساتھ ان سے کلام شروع کیا ۔برہمنوں کا حوالہ دینے کے بعد کہا کہ داروغہ صاحب آپ کے علاقے سے بیل گاڑی جارہی ہیں اور آپ کو چڑھاوا نہیں ملا دراصل میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر تحفہ پیش کرنا چاہ رہا تھا۔الوپی دین نے اپنے منشی کو ایک ہزار کا نوٹ نکال کر دینے کا حکم دیا۔داروغہ صاحب نے سخت لہجے میں جواب دیا کہ آپ نے غیر قانونی کام کیا ہے ابھی آپ کو حراست میں لیا جارہا ہے اور جمعدار بدلو سنگھ کو ہتھکڑی پہنانے کا حکم دیا!بدلو سنگھ بھی چونک گیااور وہاں موجود سارے لوگ یہ سن کر ہکّہ بکّہ رہ گئے۔الوپی دین یہ سن کر دنگ رہ گئے اور داروغہ صاحب کے قریب آئے اور بولے صاحب ایسے میری ساری عزت مٹیا میل ہو جائے گی۔مہربانی کر کے لے دیکر معاملہ رفع دفع کیجیے۔الوپی دین نے چالیس ہزار روپیے دینے تک جا پہنچا لیکن داروغہ صاحب نے ایک نہ سنی اور الوپی دین کو حراست میں لے لیا۔صبح تک یہ خبر آگ کی چنگاری کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔

داروغہ بنسی دھر نے الوپی دین کو کل ہو کر کوٹ میں پیش کیا، کوٹ میں چپر اسی سے لے کر جج تک الوپی دین کے ہی خیر خواہ تھے۔ کچھ وقت بحث کے بعد ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی کہ الوپی دین ایک ممتاز شخص ہے اور داروغہ صاحب کے پاس کوئی پختہ ثبوت موجود نہ ہونے کی وجہ سے الوپی دین کو باعزت رہا کر دیا جاتا ہے۔ داروغہ صاحب کے پاس ایمانداری کے علاوہ کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ ان پر لوگ طرح طرح کے طنز کس رہے تھے اور پنڈت الوپی دین کے چرچے ہی چرچے ہو رہے تھے۔ ایک ہفتے کے بعد داروغہ صاحب کو نوکری سے معطل کر دیا جاتا ہے اور وہ مایوسی کے ساتھ اپنے گھر لوٹ آتے ہیں۔ گھر پر بیوی، بوڑھے ماں باپ سب صدمے اور غم میں مبتلا تھے ۔ کوئی بھی سیدھے منھ بات نہیں کر رہا تھا۔ والد صاحب نے بہت کھرے کھوٹا سنایا۔ کچھ دن کے بعد پنڈت الوپی دین کی رتھ بنسی دھر کے گھر پر آ کھڑی ہوئی یہ دیکھ کر بنسی دھر کے پِتا دوڑتے ہوئے آئے اور آؤ بھگت میں لگ گئے اور ان کے سامنے ہی اپنے بیٹے پر لعن طعن بھیجنے لگے۔ اس سے اچھا ہوتا کہ بھگوان مجھے بے اولاد ہی رکھتا۔ الوپی دین نے سمجھایا کہ آپ اپنے بیٹے پر رشک کیجیے اس طرح کے ایماندار بیٹا کسی کو میسر نہیں ہوتا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد پنڈت الوپی دین بنسی دھر سے مخاطب ہو کر گزارش کی کہ میں برہمن ہوں جب تک آپ میری بات نہیں مانیں گے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا اور ایک کاغذی دستاویز بنسی دھر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جسے پڑھنے کے بعد بنسی دھر کی آنکھوں سے آنسوں نکل پڑے اور عرض کیا کہ مالک میں ایک معمولی آدمی ہوں اتنے بڑے عہدے کا حقدار نہیں ۔ الوپی دین بنسی دھر کو اپنے پورے جائیداد کا خود مختار بنانے کا حلف نامہ پر دستخط کرنے کی گزارش کر رہا تھا اور کہا کہ بابو میں پوری دنیا گھوم چکا ہوں اور ہر ایک کو پیسے کے سامنے اپنا ضمیر بیچتے ہوئے دیکھا ہے لاکھوں لوگوں سے ملا ہوں سب ایک نہ ایک وقت میں اپنے ضمیر کا سودا کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کافی لمبی گفتگو کے بعد بنسی دھر ان کاغذات پر دستخط کر دیتا ہے۔

افسانہ میں ایک موقع پر ایسا لگتا ہے کہ حق و صداقت کی ہار ہو گئی ہے۔ لیکن افسانہ کے اختتام پر سچائی اور حق کی ہی جیت ہوتی ہے۔ الوپی دین بنسی دھر کے ایمانداری کے سامنے اپنا سر خم کر دیتا ہے اور انھیں اپنی پوری جائیداد کا

خود مختار بنادیتا ہے۔ چھ (٦) ہزار روپیے سالانہ اور اس کے علاوہ روز کے خرچے، سواری کے لیے گھوڑا گاڑی اور رہنے کے لیے مکان بھی دیتا ہے۔

الغرض 'افسانہ نمک کا داروغہ' کے ذریعے منشی پریم چند نے حق وصداقت کا پیغام دیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار بنسی دھر اور پنڈت الوپی دین ہے۔ بنسی دھر نے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کیا، اپنی نوکری سے بھی معطل ہوئے لیکن اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا اور حق وباطل کے مابین ایک پہاڑ کی مانند کھڑا رہا۔ اس وقت ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ غلام تھا۔ انگریز قوم سازش، تعصب اور فریب سے صدیوں تک متحدہ ہندوستان پر مسلط تھی۔ مصنف کے دل میں آزادی کا جذبہ لبریز تھا۔ وہ مسلسل اپنی تخلیقی کارکردگی کے ذریعے ہندوستانی عوام کو فرض شناسی کا پیغام دے رہے تھے تاکہ غلامی کی زنجیروں سے نجات ملے۔

حوالہ جات:

١۔ پریم چند کے نمائندہ افسانے (پروفیسر قمر رئیس)
٢۔ افسانہ نمک کا داروغہ (منشی پریم چند)
٣۔ پریم چند فکر وفن (پروفیسر قمر رئیس)
٤۔ منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے (پروفیسر قمر رئیس)
٥۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل (پروفیسر گوپی چند نارنگ)

***